اعظم الامراء

ارسطو جاہ



اردو

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو شمارہ ۴۴

ارسطوجاہ

یعنی

غلام سید خان سہراب جنگ معین الدولہ مشیر الملک اعظم الامرا
ارسطوجاہ کے حالاتِ زندگی

از

عبد المجید صدیقی
ایم اے - ایل ایل بی - استاد تاریخ جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۹۳۹ء

ادارۂ ادبیات اردو

رفعت منزل - خیریت آباد - حیدرآباد دکن

قیمت ۶/

—— اس سلسلہ کی دوسری کتابیں۔ ——

نظام الملک آصفجاہ اول | سرسید احمد خاں
سرسالار جنگ اعظم | عماد الملک

دادابھائی نوروزجی

—— ملنے کا پتہ۔ ——

سب رس کتاب گھر

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد

مطبوعہ
مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس

فہرست

دیباچہ

اعظم الامرا ارسطو جاہ ہندوستان کے ان مشاہیر سے ہیں جنھوں نے اس ملک کی تاریخ کے بنانے میں حصہ لیا ہے۔ دکن میں انگریزوں کے اقتدار کے انحکام میں ان کے تدبر اور حکمت عملی کو بھی بڑا دخل ہے۔ میسور کی سلطنت کے زوال کی ذمہ داری بھی ایک حد تک ان کے سر ہے۔ مرہٹوں کی تاریخ تو ان کے تذکرے کے بغیر لکھی ہی نہیں جاسکتی اور حیدرآباد کی سلطنت کی تعمیر و تشکیل بھی انہوں نے جو اہم خدمات انجام دی ہیں ان کا ایک معمولی اندازہ ان عظیم الشان خطابات ہی سے ہو سکتا ہے جو ان کے نام کا جزوِ لاینفک بن گئے ہیں۔

حیدرآباد کی تاریخ میں مختار الملک سر سالار جنگ اعظم کے علاوہ کوئی شخصیت ایسی نہیں ملتی جس میں ارسطو جاہ جیسی فراست، بلند حوصلگی، اور معاملہ فہمی پائی جاتی ہو۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے سخت سے سخت

دشمن بھی جب اُن سے ملتے تو ان ہی کا سبق پڑھنے لگتے۔ نواب نظام علیخاں آصفجاہ ثانی تو ان کو اتنا چاہتے تھے کہ جب ان کے فرزند سیف الدولہ کا انتقال ہوا تو اپنے فرزند رئیس الملک سلیمان جاہ کو اور بعد کو جب ارسطو جاہ کی پونہ والی بیگم کے لڑکے کا بھی انتقال ہو گیا تو دوسرے صاحبزادے سیف الملک کیوان جاہ کو ابھی انہی کی فرزندی میں دیدیا۔

ارسطو جاہ بڑے معاملہ فہم اور مردم شناس آدمی تھے۔ اور چونکہ چھوٹے درجہ سے سلطنت کے عظیم ترین رتبہ کو پہنچے تھے اس لئے شریفوں کی اور باکمالوں کی امداد اور اعانت کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ ان کی داد و دہش اور شعرا پروری کا شہرہ دور دور پہنچ چکا تھا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ ان کے یہاں چلے آتے تھے۔ خود ان کا دربار بادشاہوں کے دربار سے کم بارونق نہ تھا۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کو بذلہ سنجی، علم و فضل اور شعر و سخن کا بھی بڑا اچھا ذوق تھا۔ اور دراصل یہی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ صرف اسی کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے۔ ان کے دربار میں حیدرآباد اور ہندوستان کے بیسیوں بلند پایہ شعرا مثل احسن اللہ خاں بیان، مرزا لطف، شیر محمد خاں ایمان اور شاہ تجلی علی تجلی وغیرہ جمع تھے جنھوں نے اپنے

قصیدوں میں ان کی زندگی کے متعلق ایسا تفصیلی مواد محفوظ کر دیا ہے کہ بڑی سے بڑی تاریخوں میں اتنی مکمل اور مفید معلومات قلمبند نہ ہو سکتی تھیں۔

شاعروں ادیبوں اور مصوروں کے فیاض قدردان ہونے کے علاوہ ارسطو جاہ خود بھی شاعر اور صاحب علم و فضل امیر تھے۔ چنانچہ جب ان کو ایلگندل میں جاگیر ذات مرحمت ہوئی تو انھوں نے فی البدیہہ ایک قطعہ تاریخ نکالا تھا کہ:۔

وَاِن شکرتم لازیدنکم (۱۱۷۹ھ)

علمی و ادبی ذوق کے علاوہ ارسطو جاہ کو تعمیر کا بھی شوق تھا چنانچہ سرور نگر کے سنگ بستہ حصار اور برجوں کو ۱۲۱۳ھ میں انھی نے بنایا تھا۔ یہ اصل میں ایک گاؤں تھا جو ارسطو جاہ کی منکوحہ سرور افزا بیگم کو آصفجاہ ثانی نے بطور جاگیر عنایت کیا تھا۔ اسی طرح حسین ساگر کے قریب اس وقت جو محلہ مشیر آباد واقع ہے وہ بھی دراصل انھی کا ۱۲۰۳ھ میں بسایا ہوا ایک گاؤں تھا جو اب تک ان کے خطاب مشیر الملک کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

غرض ایک ایسی عظیم الشان شخصیت کے سوانح حیات مرتب کرنا ملک اور تاریخ کی ایک مفید خدمت ہے جس کو پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت خوبی سے انجام دیا ہے۔ انھوں نے یہ کام اگرچہ آج سے چھ

سال پیشتر شروع کیا تھا چنانچہ ان کا ایک بسیط مضمون رہبر کے سالنامہ بابت ۱۹۳۳ء میں شائع ہوچکا ہے لیکن ادارۂ ادبیات اُردو کی خواہش پر انھوں نے اب اس میں اضافہ کر کے اس کو ایک کتاب کی شکل دیدی ہے۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ صدیقی صاحب کی مشہور تاریخ گولکنڈہ کے بعد ہی حیاتِ ارسطوجاہ شایع ہورہی ہے۔ ارسطوجاہ میں اور قطب شاہی سلاطین و امرا میں مجھے کئی طرح کی مناسبت نظر آتی ہے۔ وہی اعلیٰ ادبی ذوق، وہی فیاضی اور داد و دہش، وہی قدردانیِ فضل وکمال، وہی شرفا نوازی، وہی شگفتگیِ طبع، وہی فراخ حوصلگی، اور وہی وسیع المشربی۔ سچ تو یہ ہے کہ جب میں ارسطوجاہ کے حالاتِ زندگی پڑھتا ہوں تو مجھے قطب شاہی دور کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء

سید محی الدین قادری زور

تمہید

دکن کی تاریخ جس قدر اپنے تاریخی واقعات سے مالا مال ہے اُسی طرح اپنے فرزندوں کی وجہ سے جو دنیائے علم و سیاست کے تارے تھے فخر کرتی ہے۔ جس زمانے سے دکن کی تاریخ روشنی میں آتی ہے یہاں ہم کو لائق شخصیتوں کا ایک سلسلہ ملتا ہے جن کا تاریخ دکن بنانے میں بڑا ہاتھ ہے۔ سلاطین کے علاوہ وزراء علماً اور صوفیاء کا ایسا تانا بندھا ہوا ہے کہ اگر ان کو فراموش کر دیا جائے تو ایک طرف تاریخ کا تسلسل ہماری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اور دوسری طرف تمدن کے اکثر پہلو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جائینگے۔ سچ تو یہ ہے کہ تاریخ دکن کے اصل معمار سلاطین کے علاوہ وزراء کی عظیم الشان شخصیتیں ہیں۔ صدیاں گزرنے کے باوجود اب بھی ان کے نام تاریخ میں اسی طرح زندہ ہیں جس طرح وہ اپنے زمانے میں تھے۔ انہی جلیل القدر ہستیوں میں ایک اعظم الامراء ارسطو جاہ کا نام ناقابل فراموش ہے۔ یہ خاندانِ آصفیہ کے وزیر با تدبیر تھے۔ ان کی قابلیت اور تدبر نے ان کو ہمیشہ تاریخ میں نمایاں رکھا۔ انھوں نے حیدر آباد کی اس زمانے میں سیاسی رہنمائی کی ہے

جبکہ حیدرآباد کی سلطنت چاروں طرف سے مختلف دشمنوں کی دست درازیوں کا نشانہ بنی ہوئی تھی اور اس کو قدم قدم پر اپنے بقائے دوام کے لیے کوشش کرنی پڑتی تھی۔ ایک حملہ سے فراغت ہوتی تھی تو دوسرا مقابلہ سر پر آتا تھا۔ حضرت غفران مآب نواب نظام علی خاں کا عہد اسی کشمکش کی داستان ہے۔ سیاست کے اس خطرناک بھنور میں سے حیدرآباد کی کشتی کا صحیح سالم نکل جانا والیانِ ملک اور ان کے وزراء کے ایثار اور ان کی قربانیوں کا پھل سمجھنا چاہیئے۔ ارسطوجاہ نے جس سیاسی قابلیت سے حیدرآباد کی مدد کی ہے وہ تاریخ کے لیے یادگار ہے۔

نام و نسب

ان کا اصل نام غلام سیّد ہے جس سے ان کی تاریخ پیدائش ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے تفصیلی خاندانی حالات تو اچھی طرح واضح نہیں ہوتے۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ ان کا خاندان ایرانی تھا اور ان کے بزرگ ایران کے ساسانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے باپ فرخ نژاد خاں حضرت مغفرت مآب آصفجاہِ اول کے ملازم تھے اور غالباً یہ آصف جاہ کے ساتھ حیدرآباد آئے تھے۔ یہاں دکن میں حضرت مغفرت مآب نے فرخ نژاد خاں کو برار کا صوبہ دار بنایا تھا اور غالباً ان کا یہیں انتقال ہوا۔ غلام سید خاں حضرت غفران مآب نواب نظام علی خاں کے سلکِ ملازمت میں تھے۔ اکثر واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ حضرت غفران مآب کے ہمراہِ رکاب رہتے تھے چنانچہ حیدر جنگ کے قتل کے واقعہ میں یہ غفران مآب کے شریک حال تھے اس کے بعد یہ محالات برار کے دیوان اور صوبہ اورنگ آباد کے صوبہ دار بنائے گئے معین الدولہ بہرام جنگ ان کو خطاب ملا تھا۔ چونکہ ان میں سیاسی اور انتظامی جوہر بہت موجود تھے اس لیے اس زمانے میں بھی جبکہ وہ شمالی صوبوں کی صوبہ داری

کرتے تھے ان کو اکثر سفارتی کام دیا گیا جس کے لیے یہ بہت موزوں ثابت ہوئے۔ چنانچہ اس زمانے میں یہ راؤ پنڈت پردھان کے تصفیہ کے لیے پونا بھیجے گئے تھے اور اس کے بعد رگھوجی بھونسل کے فیصلہ کے لیے ناگپور روانہ کیے گئے تھے۔ انھوں نے اس کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور نمایاں کام کیے۔ چونکہ ان میں بلند پایہ کام کرنے کی صلاحیت تھی اور مرکزی نظم و نسق کی طرف ان کا رجحان تھا اس لیے انھوں نے برار سے حیدر آباد میں تبادلہ کی کوشش کی۔ تاکہ مرکزی حکومت میں حصہ ملے۔ جب حیدر آباد کے بڑے وزیر رکن الدولہ میر خاں کا ۱۷۷۵ء میں انتقال ہوا تو ان کی جگہ چند روز تو وقار الدولہ نے کام کیا لیکن اس دوران میں ظفر الدولہ کی ترقی شروع ہوئی اور یہ بہت جلد سلطنت حیدر آباد کے مدار المہام بنائے گئے۔ ظفر الدولہ مبارز الملک کا سلطنت حیدر آباد کا مدار المہام بن جانا غلام سید خاں کے لیے کچھ مفید نہیں ہوا۔ ظفر الدولہ اور غلام سید خاں کے تعلقات کچھ عرصے سے کشیدہ تھے اور اس کی وجہ سے ان کو حیدر آباد کی مرکزی حکومت میں رسوخ پیدا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان کو صرف وقار الدولہ سے کچھ ہمدردی کی توقع تھی، وقار الدولہ ہی نے سب سے پہلے حضرت غفران مآب سے ان کے متعلق سفارش کی تھی۔ کہ غلام سید خاں مرکزی حکومت میں کام کرنے کے قابل ہیں۔ مرکزی حکومت کا کوئی کام ان کے سپرد کیا جائے۔ حضرت غفران مآب خود غلام سید خاں سے

بخوبی واقف تھے۔ بعض ہمدردوں کی سفارش سے جن میں وقارالدولہ بھی شامل ہیں غفران مآب نے غلام سید خاں کو مرکزی حکومت میں لینا پسند فرمایا اور ان کو حیدرآباد بلا کر پیشکاری کی خدمت سپرد کی۔ اس طریقے سے یہ سلطنت کے کاروبار میں دخیل ہو گئے تھے۔ لیکن مبارزالملک کو یہ چیز ناگوار گزری اور یہ سخت ناراض ہو گئے چنانچہ اس ناراضی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مبارزالملک سرکار سے اجازت لے کر ہزمل چلے گئے اور وہاں جا کر یہ عرض کی کہ جب تک معین الدولہ سہراب جنگ حیدرآباد میں رہینگے میں مدارالمہامی کی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اگر مجھ سے خدمت لینی منظور ہو تو سہراب جنگ کو آوسہ بھیج دیا جائے۔ اس درخواست پر بندگان عالی نے مبارزالملک کے پاسِ خاطر سے غلام سید خاں کو آوسہ بھیج دیا اور مبارزالملک حیدرآباد آ گئے۔

مدارُالمہامی

اگرچہ سرکار کے حکم سے غلام سید خاں کو مجبوراً اوسہ جانا پڑا لیکن ان کی وسیع قابلیت ان کو بہت دنوں تک اوسہ میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اگرچہ وہ اوسہ کے گردوپیش سے جہاں وہ اور ان کے باپ نے برسوں تک کام کیا تھا بہت مانوس تھے لیکن قلعۂ اوسہ میں بند رکھنا ان کی وسیع قابلیت کا گلا گھونٹنا تھا۔ یہاں وہ کبھی نچنت نہیں بیٹھ سکے۔ وقارالدولہ کی زندگی تک ان سے کام نکالنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اپنے تبادلے کے متعلق ان کو بہت سے خط لکھے تھے لیکن ان خطوط کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا کہ وقارالدولہ کا انتقال ہو گیا اور یہ چند دنوں کے لیے مجبور ہو گئے۔ اب غلام سید خاں کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ خود مبارزالملک سے مل کر اپنے تعلقات صاف کریں اور اپنی ترقی کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہ غلام سید خاں کی قابلیت کی دلیل ہے کہ اپنے خاص ہتھکنڈوں سے دشمن کو دوست بنانے میں کامیاب ہو گئے جن کو اس زمانے کے مورخ ان کی دنیاداری اور سیاسی داؤپیچ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پہلے مبارزالملک کو انھوں نے ایک مخلصانہ خط لکھا اور موافقت کا

اظہار کیا اور سرکار سے اجازت لے کر خو نرل گئے اور یہاں مبارز الملک سے ملاقات کی۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اچھے خوش تقریر آدمی تھے اور مخاطب کی نفسی کیفیت پر بہت قابو تھا۔ چنانچہ اپنی خوش کلامی سے مبارز الملک کو اس قدر گرویدہ بنا لیا کہ مبارز الملک نے دیرینہ مخالفت نہ صرف اپنے دل سے بھلا دی بلکہ سرکار سے ان کی پرزور سفارش کی اور سفارش بھی ان الفاظ میں کی کہ غلام سید خاں کے بغیر میں کام نہیں کر سکتا، بلکہ مجھے دلجمعی نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ سفارش موثر تو ثابت ہوئی لیکن حضرت آصف جاہ ثانی کو شمس الدولہ کی خدمات کا خیال کر کے اس سفارش کو عملی جامہ پہنانے میں تامل ہوا کیونکہ شمس الدولہ ان سے پرانے آدمی تھے اور ان کی خدمات مسلمہ تھیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ شمس الدولہ کو فوجی انتظام سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اور سلطنت کے دوسرے امور میں وہ بہت کم حصہ لیتے تھے، اس لیے بندگان عالی نے غلام سید خاں کو حیدرآباد آنے کی اجازت دی۔ چونکہ اس وقت امورِ سلطنت کے مشورہ کے لیے ایک لایق آدمی کی ضرورت تھی اس لیے ان کو فوراً حیدرآباد بلا یا گیا حیدرآباد آنے کے بعد بھی شمس الدولہ کی طرف سے ایک رکاوٹ باقی تھی اور غلام سید خاں ان کی طرف سے مشوش تھے کہ وہ موقع نہیں دینگے لہذا ان کو راضی کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ شمس الدولہ کو راضی کرنا دوسرا مرحلہ تھا۔ چونکہ

غلام سید خاں میں اس کی بڑی قابلیت تھی اپنے خاص طریقۂ عمل اور انداز بیان سے شمس الدولہ کو اپنا موافق بنا لیا۔ ان بڑے مخالفوں کو راستہ سے نکالنے کے بعد غلام سید خاں کو سلطنت کی اعلیٰ خدمت پر پہنچنا آسان تھا۔ اگرچہ ان کے سیاسی ہتھکنڈوں کا ذکر کرکے جو اُن کی ترقی کا باعث ہوئے ہیں ان کے اخلاق پر نکتہ چینی کی جاتی ہے لیکن اس نکتہ چینی اور ملامت کے باوجود ان کی سیاسی اور انتظامی قابلیت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ ان کے سیاسی ہتھکنڈے بھی جو ظفر الدولہ مبارز الملک اور شمس الدولہ کے مقابلے میں استعمال کیے گئے تعریف کے قابل ہیں جو ان کی سیاسی قابلیت کی دلیل ہے لیکن اس کے ساتھ حضرت غفران مآب کی نظروں میں ان کی قدر و منزلت ان کی انتظامی قابلیت کی بناء پر پیدا ہوئی تھی جس زمانے میں وہ نرمل سے حیدرآباد آئے تھے تو ایک طرف ان کو شمس الدولہ کو رام کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف اپنی انتظامی قابلیت کا اظہار کرکے سرکار کو اپنی طرف مائل کرنا تھا۔ کفایت شعاری سے جس کی اس وقت ملک کو ضرورت تھی سرکاری آمدنی میں اضافہ کیا۔ عاملوں پر زرِ مقررہ بڑھا دیا اور تاجروں پر محاصل زیادہ کیے اور حکومت کو انھوں نے اضافہ آمدنی کے مختلف ذرائع بتائے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حضرت بندگان عالی کو ان پر رفتہ رفتہ اعتماد ہونے لگا۔ اور شیر الملک خطاب دے کر ان کو انتظامی کام سپرد کیا گیا۔ پہلے یہ مددگارِ دیوان بنائے گئے تاکہ دیوان کے ساتھ

کام کر کے مزید تجربہ حاصل کریں۔ اگرچہ یہ عرصہ تک مددگار رہے لیکن ان کی ہمہ گیر قابلیت تمام امور سلطنت پر مسلط ہو گئی اور مددگار کی حیثیت میں اس قدر چھا گئے تھے کہ تمام مالی اور ملکی امور میں دخیل ہو گئے تھے اور بغیر عطا خلعت کے مدار المہامی کا کام کرتے تھے۔ لیکن جب ظفر الدولہ مبارز الملک کا انتقال ہو گیا تو ابو الفتح خاں شمس الملک کے مشورہ سے ۱۷۸۱ء میں ان کو مدار المہامی کی خدمت عطا ہو کر بحالی و برطرفی کے جملہ اختیارات ملے اور غالباً اسی وقت ان کو اعظم الامراء کا خطاب، یک ہزاری ذات و یک ہزاری سوار عطا ہوئے جو ان کے گزشتہ خطابات معین الدولہ سہراب جنگ مشیر الملک کے علاوہ تھے۔ جب ۱۷۸۱ء میں آصف جاہ ثانی نرمل سے واپس ہوئے تو اعظم الامراء کا تقرب اور بڑھا دیا۔ یہ سفر جگتیال کے قلعہ دار کی بغاوت کے سلسلے میں ہوا تھا۔ جب قلعہ مذکور کے غاصب ظفر الماس حبشی کو مغلوب کر کے حیدر آباد میں مراجعت ہوئی تو ۱۷۸۱ء میں اعظم الامراء کو مزید تقرب حاصل ہوا اور اختیارات میں اضافہ ہوا۔ دفتر پیشکاری اور دیوانی جو راجہ دیانت ونت اور راجہ امانت ونت سے متعلق تھے وہ بھی ان راجگان کے توسط سے مشیر الملک سے متعلق کر دیے گئے تھے۔

دکن کا سیاسی انتشار

ارسطوجاہ نے حیدرآباد کی عنانِ وزارت ایسے وقت ہاتھ میں لی تھی جبکہ تمام دکن کے سیاسی تار و پود جگہ جگہ سے بکھر رہے تھے۔ اٹھارہویں صدی ہندوستان کا ایک بہت ہی تاریک دور ہے۔ جس طرح شمالی ہند اس دور میں سیاسی کشمکش کا ایک دنگل بنا ہوا تھا، دکن بھی گوناگوں سیاسی الجھنوں کا شکار تھا۔ حضرت مغفرت مآب کے انتقال اور ناصر جنگ شہید کی بے وقت موت سے حیدرآباد کی نوخیز سلطنت کو جس قدر نقصان پہنچا ہے اس کی پھر تلافی نہ ہو سکی۔ چونکہ حیدرآباد سلطنت دکن کے وسط میں واقع ہے۔ جغرافی اعتبار سے اس کا موقع محل بہت خطرناک واقع ہوا تھا۔ اس سلطنت کے دشمنوں کو اس پر چاروں طرف سے حملہ کرنے کا موقع ملتا تھا اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ اس زمانے میں یہ سلطنت چاروں طرف سے سخت دشمنوں میں گھری ہوئی تھی اور شرق میں مغربی اقوام تو اس سلطنت کو صاف ہضم کرنا چاہتی تھیں مرہٹوں کی شمالی طاقت جو آئے دن حیدرآباد پر امنڈ آتی تھی اس سے حیدرآباد کا عہدہ برآ ہونا بہت مشکل تھا۔ حضرت مغفرت مآب نے مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلے میں جس تدبر سے حیدرآباد کو بچا کے رکھا

وہ تاریخ کے لیے یادگار ہے، لیکن ان کے انتقال کے بعد ناصر جنگ کا جو اپنے باپ کے صحیح جانشین تھے بے وقت مرجانا ان حالات کے لیے بہت مضر ثابت ہوا اور حیدرآباد کے دشمنوں کو پیش قدمی کرنے کا موقع ملا۔ اس پر طرہ یہ کہ صلابت جنگ جیسے آدمی ان حالات میں ناخدائے سیاست بنائے گئے تھے جو کسی طرح اہل نہیں تھے۔ ان کی سیاسی کمزوری حیدرآباد کی فضا کے لیے بہت مضر ثابت ہوئی صلابت جنگ فطرتاً کمزور تھے اور چونکہ فرانسیسی جنرل بسی نے ان کی بادشاہی کا اعلان کیا تھا اس لیے یہ اپنے کو فرانسیسیوں کا آفریدہ سمجھتے تھے اور ان کے زیر اثر تھے حالانکہ یہ اپنی کلاہت کی وجہ سے بادشاہ بنائے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فرانسیسی سلطنت میں برابر کے شریک ہوگئے اور اپنے مصارف کے لیے شمالی سرکار جیسے حیدرآباد کے زرخیز اضلاع ہضم کر گئے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ صلابت جنگ کا تیرہ سالہ عہد حکومت تاریخ دکن کا بہت ہی تاریک دور ہے اگر اس وقت نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کا وقتاً فوقتاً مشورہ اور تائید شامل نہ ہوتی تو خدا نخواستہ حیدرآباد کو برے دن دیکھنے پڑتے۔ آصفجاہ ثانی حضرت غفران ماب کی ان تھک کوششوں سے ایک طرف مرہٹوں کے حملوں سے خاطر خواہ مدافعت ہوسکی اور دوسری طرف فرانسیسیوں کی طاقت ٹوٹ گئی۔

صلابت جنگ کے کمزور عہد میں سلطنت حیدرآباد کو جو نقصان پہنچے ہیں اس کا

آئندہ حکومت کو عرصۂ دراز تک خمیازہ بھگتنا پڑا۔ حکومت کو قدم قدم پر مالی خسارہ برداشت کرنا پڑا تھا اور اندرونی نظم و نسق کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ دوسری طرف بیرونی دشمنوں کا مقابلہ تھا جو دلیر ہو کر حیدرآباد پر ہر وقت دھاوا بولتے تھے ......

•

....

جنوب کی سلطنت میسور حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان کے عہد میں اس قدر طاقتور ہو گئی تھی کہ ہندوستان کی دیسی ریاستیں تو کجا خود کمپنی کو اس سے غیر معمولی ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ کمپنی نے اس کے خاتمہ کے لیے اپنا تمام تر زور لگا دیا تھا اور حیدرآباد کو بھی اس سے کئی مقابلے کرنے پڑے۔ مشرق میں انگریز کمپنی دکن کی سیاست میں برابر کی دخیل ہو گئی تھی۔ ڈوپلے کے بعد جب فرانسیسی مغلوب ہو گئے تو انگریزوں نے ان کی جگہ لی اور اپنا اقتدار بڑھایا۔ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے دکن کی سیاست متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن حیدرآباد کو جس طاقت سے زیادہ ڈر تھا اور جس سے اس سلطنت کو بار بار نقصان اٹھانا پڑا ہے وہ شمال کی مرہٹہ سلطنت تھی ۱۷۶۱ء تک باجی راؤ اور بالاجی راؤ کے عہد میں جو سلطنت مرہٹہ کے مختار تھے مرہٹوں نے ہندوستان سے جو ناقابلِ تسخیر طاقت فراہم کر لی تھی اس کا تمام ملک میں جواب نہیں تھا۔ کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اگرچہ ۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت سے اس کی طاقت کو دوگونہ نقصان پہنچا تھا۔ ایک تو ان کی طاقت کا بہترین ست

پانی پت کے میدان میں کام آگیا تھا۔ دوسرے اس شکست کے صدمے سے بالاجی راؤ کا خاتمہ ہوگیا جو اس طاقت کا روح رواں تھا لیکن اس کے باوجود چوتھے پیشوا مادھو راؤ کے عہد میں ان کا دوبارہ ابھرنا ان کی زندگی کا حقیقی ثبوت تھا۔ اگرچہ مادھو راؤ اتنا بڑا مدبر نہ تھا کہ وہ بڑے مشاہیر کی فہرست میں کھڑا ہو سکے۔ لیکن مرہٹوں کی ترقی میں اس نے کوئی تسمہ نہیں لگا رکھا اور اس کے علاوہ اس وقت حالات نے دکن کے ایک مشہور ہیرو نانا فرنویس کو پیدا کر دیا تھا جو بڑے پیشواؤں کا مد مقابل تھا۔ اس نے حالات کا مطالعہ کر کے مرہٹوں کی منتشر طاقتوں کو اس خوبی سے یک جا کر دیا کہ اس قوم میں ایک جان پڑ گئی اور پانی پت کی جنگ کی تلافی ہوگئی۔

صلابت جنگ کی کمزوری سے موقع پا کر مرہٹوں نے ۱۷۶۰ء میں حیدرآباد کے شمالی علاقوں پر حملہ کیا تھا اور سازش کر کے احمد نگر، بہادر گوڑہ اور دیگر مقامات پر قبضہ کر لیا۔ جب حیدرآباد کی فوجوں نے مزاحمت کی تو اودگیر کے مقام پر حیدرآباد کو بڑی ہزیمت ہوئی اور عہدنامہ کی رو سے ۶۲ لاکھ سالانہ آمدنی کے علاقے جن میں قلعہ دولت آباد، قلعہ بیجاپور، اسیر گڑھ، ہرسول، ستارہ، احمد نگر اور اورنگ آباد کے اکثر علاقے صوبہ برہان پور اور صوبہ بیدر دینے پڑے تھے۔ لیکن جب ۱۷۶۱ء جنگ پانی پت میں مرہٹوں کی طاقت ٹوٹی تو حضرت غفران مآب نے جنگ اودگیر کا انتقام لینے کے لیے پونا پر پیش قدمی کی تھی اور اس جنگ میں اورنگ آباد اور بیدر کے علاقے جن کی آمدنی ۲۷ لاکھ تھی مرہٹوں سے دوبارہ حاصل کیے تھے۔

ارسطو جاہ کے کارنامے

صدرالمہام ہونے کے بعد سب سے پہلا کام اعظم الامراء کا جنگ میسور میں شرکت اور اس کو کامیاب بنانا تھا۔ سلطنت میسور کے اختلافات کی وجہ سے جو حیدر علی کے بعد سے چلے آتے تھے ۱۷۸۵ء میں مرہٹوں کی تائید کے ساتھ میسور پر حملہ کیا گیا تھا۔ مرہٹوں کے ساتھ یہ اتحاد خود مرہٹوں کی تحریک سے پیدا ہوا تھا۔ اس اتحاد کے لیے بالاجی راؤ پیشوا اور راؤ پنڈت پردھان حضرت غفران مآب سے ملنے کے لیے آئے اور اودگیر میں ملاقات کی اور یہ طے ہوا کہ دونوں طاقتیں متحدہ طور پر میسور پر حملہ کریں۔ لیکن جب حیدرآباد کی فوجیں میسور پر بڑھیں تو مرہٹوں نے وعدہ کے مطابق مدد نہیں کی بلکہ اُلٹا یہ ہوا کہ بیجاپور کے مسئلے میں دونوں ناراض ہو گئے حیدرآباد کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑا۔ مرہٹوں کی اس بے وفائی سے آصفجاہ ثانی کا دل اس مہم سے برداشتہ ہو گیا اور یہ حیدرآباد واپس ہو گئے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ ٹیپو سلطان نے امتیاز گڑھ کے قلعہ پر دھاوا بول دیا ہے۔ نظام علی خاں نے ٹیپو کے مقابلے اور محصورین قلعہ کو چھڑانے کے لیے خود حملہ کرنا چاہا اور کوچ کے لیے

تیار ہو گئے لیکن شمس الملک اور اعظم الامراء نے خود یہ مہم اپنے ہاتھ میں لی اور بندگانِ عالی کو بذاتِ خود جانے سے روک دیا۔ حیدر آباد کی اس فوج کے خطرے سے ٹیپو نے بہت جلد محاصرہ اٹھالیا اور اس طریقے سے داراجاہ کی بیوی بچے سلامتی کے ساتھ اس قلعہ سے نکال لیے گئے۔ حضرت غفران مآب ناموس آصفیہ کی حفاظت سے بہت خوش ہوئے اور جب ادھونی سے یہ فوج واپس ہوئی تو جشن عید الضحیٰ میں شمس الملک اور اعظم الامراء کو زمرد کے طرّے اور موتیوں کے آویزے عطا کیے۔

میسور کی تیسری لڑائی

میسور کی ہمسایہ طاقتوں میں جنھوں نے میسور کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی حیدرآباد بھی شریک تھا حقیقت یہ ہے کہ میسور کی تمام لڑائیاں اور اس کا خاتمہ انگریز کمپنی کے حرص و آز کا نتیجہ تھا۔ دکن کی تمام طاقتوں میں میسور ایک ایسی سلطنت تھی جس سے کمپنی کو ڈر لگتا تھا۔ ایک تو اس سلطنت کا قوی عزم دوسرے اس کے دور دراز سلطنتوں سے تعلقات ہر روز خطرہ بڑھاتے تھے۔ اس سلطنت سے فرانسیسیوں کو تقویت ہو گئی تھی۔ اس لیے کمپنی کو اس سلطنت سے ڈرنا ضروری تھا۔ میسور کی تیسری لڑائی جو ۱۷۹۰ء میں شروع ہوئی اس کی ذمہ دار ہندوستانی طاقتوں سے زیادہ جن میں حیدرآباد، مرہٹے شامل ہیں خود کمپنی تھی۔ ہندوستانی سلطنتوں کی شرکت خود کمپنی کی ترغیب سے تھی اس سے میسور کا خاتمہ نہیں بلکہ اس سے اپنی طاقت بڑھانا مقصود تھا۔ اس حملۂ میسور میں کمپنی کی جو فوجیں جنرل میڈوز کے تحت آئی تھیں اس کی امداد کے لیے مرہٹے اور حیدرآباد جو پہلے سے میسور پر خار کھائے بیٹھے تھے برابر کے شریک ہو گئے۔ موقع کی نزاکت کچھ ایسی تھی کہ دوسرے سال خود گورنر جنرل کارنوالس

بذات خود اس حملے میں شریک ہو گیا۔ حضرت غفران مآب آصف جاہ ثانی خود عازم جنگ ہوئے تھے لیکن یہ پانگل میں ٹھیرے رہے اور فوج کی رہنمائی شاہزادہ سکندر جاہ اور اعظم الامراء کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ اس لڑائی میں سکندر جاہ کے ساتھ اعظم الامراء کی تائید شاملِ حال تھی۔ یہی انگریز افسروں سے ملتے تھے اور جنگ کی ڈھنگ ڈالتے تھے۔ جب ۱۲۹۱ء میں سرنگا پٹم پر دھاوا بولا گیا تو اس یورش میں اعظم الامراء اور ہری پنڈت کارنوالس کے ساتھ برابر کے شریک تھے ان کی کوششوں سے فوج کی تنظیم نہایت اچھی ثابت ہوئی اور میسور کی جیسی بڑی سلطنت کو نیچا دکھایا۔ جب میسور سے صلح ہوئی تو اس سے حیدر آباد کو بھی بہت مالِ غنیمت ملا۔ سلطنت میسور کا نصف حصہ جو حلفاء جنگ کے حصے میں آیا تو اس میں سے ایک تہائی حیدر آباد کو ملا۔ دریائے تنگبھدرا کے شمال کا حصہ جو پہلے حیدر آباد کے ہاتھ سے نکل گیا تھا وہ حاصل ہو گیا، کڑپہ، سدھوٹ اور کنچی کوٹہ وغیرہ جس کی آمدنی ایک کروڑ روپیہ تھی حیدر آباد کو حاصل ہوئے اور ایک کروڑ روپے نقد ملے۔

جنگ کھرڈلہ

جنگ کھرڈلہ دکن کی بہت بڑی جنگ ہے جو حیدر آباد اور مرہٹوں کے درمیان واقع ہوئی۔ اس کے اسباب بہت دیرینہ تھے۔ مرہٹے ایک عرصے سے حیدر آباد سے چوتھ اور سرویس مکھی کے مدعی تھے۔ میسور کی جنگ ختم ہوتے ہی ان محصل کا حیدر آباد سے شدید تقاضا ہونے لگا اور اس گتھی کا سلجھانا بہت مشکل تھا جو بالآخر ایک بڑی جنگ کی صورت میں نمودار ہوا۔ میسور کی لڑائی ختم ہونے کے بعد کارنواس نے تمام حلفائے جنگ میں ایک عہدنامہ کفالت مرتب کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ حلیف آئندہ ایک دوسرے کے دوست رہیں اور کسی پر دست درازی نہ کریں اور اس طریقے سے دکن میں امن قائم رہے۔ اس کے لیے موثق ضمانت کی ضرورت تھی اور حیدر آباد کی سلطنت اس کے لیے بخوشی تیار تھی مگر مرہٹے اس کے لیے تیار نہ ہوئے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس عہدنامے کی رُو سے ان کے ہاتھ بندھ جائیں گے اور ان کو پھر حیدر آباد سے کچھ نہیں ملے گا۔ اس انکار کے بعد آصفجاہ ثانی اور اعظم الامراء نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ یہ عہدنامہ کفالت کمپنی اور حیدر آباد کے درمیان میں مرتب ہو جائے جو باقی دو حلیف

ہیں۔ لیکن یہ کوشش اس وجہ سے بار ور نہیں ہوئی کہ ۱۷۹۳ء میں کارنواس ہندوستان سے چلا گیا اور اس کی جگہ سر جان شور گورنر جنرل ہو کر آیا تھا۔ جس نے "عدم مداخلت" کے اصول کو پیش نظر رکھ کر اس کو نظر انداز کر دیا۔ مرہٹوں کے مطالبات روز بروز تیز ہونے لگے اور بالآخر پونا سے گوبند راؤ کالے ایلچی بنا کر تصفیہ مطالبات کے لیے حیدرآباد بھیجا گیا جس نے دو کروڑ ساٹھ لاکھ روپیوں کا مطالبہ کیا۔ اعظم الامراء سے گفتگو ہوئی اول تو خود مطالبہ ناجائز تھا دوسرے اس کے مطالبہ کے لیے جس شخص کو یہاں بھیجا گیا تھا وہ دربار دکن کی سفارت کے قابل نہیں تھا۔ اعظم الامراء نے کہا کہ اس معاملہ کے انفصال کے لیے خود نانا فرنویس کو آنا چاہیے۔ ایلچی نے کہا کہ "نانا فرنویس" ان دنوں بہت مصروف ہیں وہ کیسے آسکتے ہیں۔ اعظم الامراء نے کہا کہ وہ کیسے آسکتے ہیں؟ میں ابھی بتاتا ہوں کہ وہ حضور میں کیسے کشاں کشاں چلے آتے ہیں"۔ ان الفاظ سے پونا کی حکومت بہت بھڑکی اور فوراً آمادۂ جنگ ہو گئی۔

جس وقت مرہٹوں کی طاقت نانا فرنویس کی رہنمائی میں اپنے پورے عروج پر تھی۔ پیشوا مادھو راؤ نانا رائن نانا فرنویس کے ہاتھ میں کٹ پتلی تھا مرہٹہ سلطنت کے تمام طول وعرض نانا کے زیر اختیار تھے اور تمام مرہٹہ فوجیں اس کے اشارہ پر کام کرتی تھیں۔ ۱۷۹۴ء میں مادھوجی سندھیہ کے انتقال سے

نانا کی طاقت اور بڑھ گئی تھی اور اس کا کوئی مدِ مقابل نہیں رہا تھا۔ اس طرح نانا نے حیدرآباد کے مقابلے کے لیے اپنی پوری طاقت جمع کردی۔ نانا اس بات کو بھول گیا تھا کہ آج سے بیس سال پہلے رگھو با کو تخت سے اتارنے میں حیدرآباد نے نانا فرنویس کی کس قدر مدد کی تھی۔ اور اگر اس وقت حیدرآباد نانا کی مدد نہیں کرتا تو شاید رگھوبا کے مقابلے میں نانا کے قدم نہیں جمنے پاتے۔ دوسری طرف حیدرآباد کے لیے یہ وقت تھی کہ مرہٹوں کے مقابلے میں ان کا کوئی حلیف نہیں تھا۔ اعظم الامرا نے مرہٹوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کی پیش بندی کر کے مرہٹوں کے شمالی رئیس مادھوجی سندھیہ سے اتحاد کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ تدبیر حیدرآباد کے لیے نہایت مفید ثابت ہوتی۔ چونکہ نانا اور سندھیہ میں غایت درجہ کی رقابت تھی۔ اس لیے اس رکاوٹ سے اول تو نانا حیدرآباد پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ دوسرے سندھیہ کی تائید کی وجہ سے نانا کو کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔ لیکن سندھیہ کی موت سے یہ تمام کام خراب ہوگیا۔ اس کے علاوہ انگریز کمپنی نے بھی اپنے پچھلے معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر حیدرآباد کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ ۱۷۶۶ء اور ۱۷۹۲ء کے معاہدہ کی رو سے انگریز کمپنی کا اخلاقی فرض تھا کہ اس آڑے وقت میں حیدرآباد کی مدد کرتی لیکن سرجان شور کی ناعاقبت اندیشی اور بے وفائی نے نہ صرف حیدرآباد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا بلکہ کمپنی کے وقار کو ایک عرصے کے لیے

خاک میں ملا دیا۔ بہر طور حیدر آباد کی سلطنت کو اس وقت مرہٹوں کے سیلاب کے مقابلے میں تنہا کھڑا ہونا پڑا تھا۔

مرہٹوں کا لشکر متعدد مرہٹہ رئیس اور مرہٹہ سرداروں پر مشتمل تھا جو نانا فرنویس کے اثر سے اس لڑائی کے لیے جمع ہوئے تھے۔ پیشوا کے علاوہ دولت راؤ سندھیہ رگھوجی بھونسلہ، تکاجی ہولکر، گوبند راؤ گیکوار کی متحدہ فوجیں اس میں شامل تھیں اور اس طریقے سے مرہٹہ فوج کی جملہ تعداد تقریباً ایک لاکھ کے قریب پہنچ گئی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ لوٹ مار کے لالچ سے دس ہزار پنڈارے بھی شریک فوج تھے ...... فوج کے بعض حصے ایسے تھے جن کی کمان بیروں جیسے فرانسیسی افسروں کے ہاتھ میں تھی۔ برخلاف اس کے حیدر آباد کی فوجیں اسی قدر باضابطہ اور مضبوط تھیں۔ خود اعظم الامراء جو اس وقت سیاست حیدر آباد کے روح رواں تھے اپنے جوان اکلوتے بیٹے کی موت سے جو عین اسی زمانے میں واقع ہوئی تھی اس قدر خستہ اور پریشان حال تھے کہ ان میں جنگ میں حصہ لینے اور فوجوں کی رہنمائی کی مطلق سکت نہیں تھی بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس صدمۂ جاں کاہ سے وہ بے خود حیدر آباد کی سڑکوں پر نکل جاتے تھے۔ میر عالم کے مشورہ سے حضرت غفران مآب نے اپنے چھوٹے بیٹے جہانگیر علی خاں سلیمان جاہ کو ان کی آغوش میں دیدیا تھا کہ ان کو اطمینان قلب نصیب ہو اور اس آڑے وقت میں ان کے

قیمتی مشورہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس عزت افزائی سے ان کے حواس بجا ہوئے اور وہ جنگ مرہٹہ کے لیے تیار ہو سکے اور فوج کی تیاری شروع ہوئی باغ گوردھن داس میں فوج جمع کی گئی۔ حضرات غفران مآب اور اعظم الامراء نے یہاں فوج کا معائنہ کیا اور فوج کے ساتھ بیدر پہنچے۔ بیدر کے قیام میں مہادیوجی سندھیہ کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی جس سے غفران مآب اور اعظم الامراء کو بہت تشویش ہوئی کیونکہ اس کے انتقال سے حیدرآباد کے منصوبہ پر پانی پھر گیا تھا۔ بیدر سے مہادیوجی سندھیہ کے جانشین دولت راؤ کو حسب سابق شریک اتحاد کرنے کی کوشش کی گئی لیکن نانا فرنویس کی وجہ سے یہ کوشش بارور نہ ہو سکی نانا فرنویس نے دولت راؤ کو بہت سی امیدیں دلا کر اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ حیدرآباد صرف اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے مجبور تھا۔ کھرلہ کے قریب مرہٹوں سے ۱۳ر شعبان ۱۲۰۹ھ کو مقابلہ ہوا۔ لڑائی بہت گھمسان کی تھی۔ جنگ کا ابتدائی حصہ حیدرآباد کے موافق معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ بعض بے وفاؤں نے محض اعظم الامراء کی مخالفت کی وجہ سے کام خراب کیا اور وقت پر کمک نہیں پہنچائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر جاں نثار افسر و سپاہی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ جن جان نثاروں نے اس جنگ میں انتہائی وفاداری کا ثبوت دیا تھا ان میں روشن خاں مظفر الملک اور منصور الدولہ کے

نام آتے ہیں جو سلطنتِ آصفیہ کے بڑے امراء میں سے تھے جن کو دکن کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان جگر باز سپاہیوں نے مرہٹوں کو بار بار شکست دے کر آصفی پرچم کی حفاظت کی اور جس وقت پرچم مرہٹوں کے ہاتھ میں چلا گیا تو ان لوگوں نے جان جوکھوں میں ڈال کر انتہائی عرق ریزی کے ساتھ اس کو حاصل کیا اور حضور میں بار بار عرض کروایا کہ اگر وقت پر کمک سے ہماری مدد کی جائے تو فتح ہماری ہے لیکن غفران مآب کے تاکیدی احکام کے باوجود بے وفاؤں نے کمک پہنچانے سے چشم پوشی کی اور ان جگر بازوں کو میدان میں مرنے دیا۔ جب ان امراء کا میدان میں خاتمہ ہو گیا تو مرہٹوں نے یلغار شروع کیا اور رات کی تاریکی میں حیدر آباد کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ اب حملہ کرنا تو کجا خود اپنے کو بچانا تھا۔ اس لیے حضرت غفران مآب نے میدان سے پیچھے ہٹ کر قلعہ کھرڑلہ میں پناہ لی لیکن یہاں بھی بے شمار مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مرہٹوں کے حملے کے علاوہ پنڈارے علیحدہ لوٹ مار کر رہے تھے اور حیدر آبادی سپاہیوں کو رات کی تاریکی میں اپنا بچاؤ کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ دشمن کون ہے اور کس پر حملہ کرنا چاہیے۔ اس نازک وقت میں سوائے صلح کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ گوبند کشن کے ذریعے سے صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی۔ پنڈت پردھان کے حسب خواہش اعظم الامراء خود گفتگو کرنے کے لیے گئے۔ اور

۹؍رمضان کو عہد نامہ مرتب ہوا جو حیدر آباد کی سلطنت کے لیے بہت ذلت آمیز تھا اس معاہدہ کی رُو سے حیدر آباد کو بہت کچھ دینا پڑا اور مرہٹوں کے تمام شرائط تسلیم کرنے پڑے۔ دولت آباد کا قلعہ اور دریائے تاپتی سے لے کر قلعہ پرینڈہ تک کا سارا علاقہ سلطنت پونا کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طرح ۳۵ لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے علاقے حیدر آباد کے ہاتھ سے چھن گئے۔ اس کے علاوہ تین کروڑ نقد معاہدے میں طے ہوئے ایک کروڑ تو اسی وقت نقد دینا پڑا اور بقیہ رقم کے متعلق یہ طے ہوا کہ ۳۵ لاکھ سالانہ کی قسط ادا کی جائیگی۔ لیکن اس پر طرہ یہ تھا کہ مرہٹوں نے ادائی رقم کے لیے اعظم الامراء کی شخصی ضمانت طلب کی جو حضرت غفران مآب کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ مرہٹے انھیں کو تمام لڑائی کا ذمہ دار سمجھتے تھے اس لیے ان کو اپنے پاس نظر بند کر کے انتقام لینے کی کوشش کی۔ اس شرط سے اعظم الامراء کے مخالف خوش ہوں تو ہوں لیکن حضرت غفران مآب کو اس سے دلی صدمہ ہوا۔ پہلے تو حضرت نے جانے کی اجازت نہیں دی بلکہ دوبارہ مقابلے کے لیے تیار ہو گئے لیکن "آں نمک خوار خیر خواہ خیر اندیش بہ ممانعت پیش آمدہ عرض کرد کہ ملال خاطر نصیب اعدا باشد....... قصد دیگر نباید فرمود" لیکن غفران مآب کو اس سے اس قدر قلق ہوا کہ خود بدولت و اقبال باچشم گریاں اعظم الامرا را روانہ لشکر راؤ پنڈت پردھان فرمودند۔" ان شرائط صلح اور ان کی تکمیل کے بعد غفران مآب نے

مع فوج کے ۱۲؍ رمضان کو حیدر آباد کا رُخ فرمایا اور شوال کی سات تاریخ حیدر آباد پہنچ گئے اور راجہ شام راج کو اعظم الامرار کی نیابت میں مدار المہامی کا کام سپرد کیا گیا۔

اعظم الامراء پونا میں

اعظم الامراء جیسے ایک جلیل القدر وزیر کا مرہٹوں کے ہاتھ میں دیا جانا حیدرآباد اور اس کے رئیس کے لیے ایک دردناک واقعہ تھا لیکن جنگ کھرڈلہ کی آئندہ مصائب سے بچنے کا یہی ایک واحد ذریعہ تھا اور یہ اعظم الامراء کی انتہائی خیرخواہی اور وفاشعاری کی دلیل تھی کہ انھوں نے اپنے رئیس کو آئندہ مصیبتوں سے بچانے کے لیے اپنی قربانی سے دریغ نہیں کیا بلکہ غفران مآب کے اصرار کے باوجود مرہٹوں کے ہاتھ میں چلے گئے ورنہ اگر وہ اپنی جان اور عزت کی پروا کرتے تو شاید حیدرآباد کو اور بُرے دن دیکھنے پڑتے۔ اعظم الامراء کے اس ایثار سے نہ صرف جنگ کھرڈلہ کی مزید مصیبتوں سے بچاؤ ہو سکا بلکہ ان کی قابلیت کی وجہ سے جو پونا کی نظربندی میں انھوں نے ظاہر کی۔ جنگ کھرڈلہ کے نقصانات کی بہت جلد تلافی بھی ہو گئی۔

مرہٹہ کیمپ میں بھی اس جلیل القدر وزیر نے اپنی اور اپنے رئیس کی عظمت برقرار رکھی یا یوں کہنا چاہیے کہ ان کا اور ان کے رئیس کا رعب و داب اتنا چھایا ہوا تھا کہ مرہٹے ان کی غیرمعمولی تعظیم کرنے پر مجبور تھے۔ نانا فرنویس نے پانچ ہزار سواروں کے ساتھ تین کوس آگے آکر ان کا ایسا استقبال کیا کہ گویا یہ اس کے معزز مہمان

نہیں ملکہ اس کے رئیس تھے ۔ اور جب یہ پیشوا مادھو راؤ کے خیمے میں گئے تو اس نے بھی سروزانو اٹھ کر ان کی تعظیم کی اور اپنے برابر بٹھایا۔ پونا میں ان کو ایک پرانے باغ میں ٹھہرایا گیا تھا اور ان کی نگرانی کے لیے ایک ہزار فرنگی جوان اور ایک ہزار عرب متعین کیے گئے تھے۔ لیکن حضرت غفران مآب نے ان کی تنہائی کا خیال کر کے ان کا پورا اسٹاف ان کے ہمراہ کر دیا تھا۔ ان کے تمام ملازم ان کے ساتھ تھے نیز ان کی ہم نشینی اور تفریح طبع کے لیے حافظ یار جنگ، اسمٰعیل یار جنگ، لعل محمد خاں، لعل علی خاں، رحمان نواز جنگ اور رفیق یار جنگ ہمراہ رکھے گئے تھے۔ چنانچہ یہ تمام ہمراہی تا قیام پونا ان کے ساتھ رہے اور ان کے وقار کو برقرار رکھا۔

پُونا سے رہائی

اعظم الامراء پونا میں کم و بیش دو سال نظر بند رہے ۔ اس نظر بندی کے دوران میں اس جلیل القدر وزیر کو جو قلبی تکلیف ہوتی تھی وہ اس زمانے کے واقعات سے ظاہر ہے ۔ ایک وزیر باتدبیر کے لیے جس کی تمام عمر رتق و فتق سلطنت میں گزری تھی ایک پرانے باغ کی چار دیواری میں بے دست و پا ہو جانا سوہانِ روح سے کم نہیں تھا ۔ دوسرے وہ اپنے ولی نعمت کی خدمت سے محروم تھے ۔ اور ان کو یہ رنج تھا کہ کھرڑلہ کی شرمناک شکست کچھ انہیں کی وجہ سے ہوئی تھی اور ان کو اس کی بہت جلد تلافی کرنی چاہیے گو حالتِ نظر بندی میں وہ مجبور تھے لیکن ان کے قلبی جذبات اپنے ملک اور مالک کے ساتھ تھے اور ان کے قلبی جذبات نے آخر کو ایسے حالات پیدا کر دیے کہ جس سے نہ صرف ان کی نظر بندی کی زنجیریں کٹ گئیں بلکہ جنگ کھرڑلہ کے سب نقصانات کی تلافی ہو گئی ۔

جنگ کھرڑلہ ختم ہونے کے بعد پیشوا مادھو راؤ نے نانا فرنویس کی جکڑ بندیوں سے بیزار ہو کر اپنے کو چھت پر سے گرا دیا اور خودکشی کر لی ۔ اس کی موت نہ صرف

نانا فرنویس کی عظمت بلکہ تمام مرہٹہ قوم کی بقا کے لیے بےحد مضر ثابت ہوئی کیونکہ اس وقت نانا اور دیگر عمائد سلطنت کے لیے باجی راؤ یا اس کے دوسرے بھائیوں کو تخت نشین کرنا ضروری تھا جو نانا فرنویس کے دشمن رگھوبا کی اولاد تھے اور جس کو نانا نے پابہ زنجیر مقید کر رکھا تھا۔ اس وقت نانا کے ہوش و حواس گم ہو گئے اور مادھوراؤ کی بیوہ کو تبنیٰ بنانے کی تجویز پر غور کرنے لگا تاکہ ایک چھوٹے لڑکے کو گدی نشین کر کے اپنے اختیارات قائم رکھے ورنہ دوسرا چارۂ کار اس کے پاس یہ تھا کہ بالاجی راؤ کے الاتی بھائی امرت راؤ کو جو عمر میں بہت چھوٹا تھا تخت نشین کرے۔ لیکن جب وہ باجی راؤ کے لیے ہی مجبور ہو گیا تو آخر یہ کوشش کی کہ اس کو گدی نشینی کے بہانہ سے بلوا کر ایک داؤ سے قید کر دے۔ ان معاشی پیچیدہ حالات میں اعظم الامراء کو موقع ملا۔ اور انھوں نے اپنے سیاسی ہتھکنڈوں سے کام لے کر ان حالات کو اپنے موافق مطلب بنانے کی کوشش کی۔ پہلے تو انھوں نے دولت راؤ سندھیہ کو جو پونا کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا اپنے ہمراہی لعل علی خاں کے ذریعے نانا فرنویس کے ارادوں سے باخبر کیا کہ وہ امرت راؤ جیسے ایک کمسن لڑکے کو گدی نشین کر کے اپنے اقتدار کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس اطلاع سے دولت راؤ بہت خوش ہوا۔ اس اثناء میں نانا فرنویس نے امرت راؤ کو گدی نشین کر دیا تھا لیکن

عمائد سلطنت میں اس قدر اختلافات ہوئے اور دولت راؤ کا اس قدر زور پڑا کہ آخر نانا باجی راؤ کی گدی نشینی کے لیے مجبور ہو گیا۔ اس اثناء میں بہ سبیل اتفاق دولت راؤ کا اس باغ پر سے گزر ہوا جہاں اعظم الامراء ٹھیرائے گئے تھے ان کے ہمراہی ان کے گھوڑوں کی تعریف کرکے اس کو باغ میں لائے اور اس طریقے سے دولت راؤ کی اعظم الامراء سے ملاقات ہوئی اس ملاقات میں کوئی سیاسی گفتگو تو نہ ہوئی لیکن دولت راؤ کا اعظم الامراء کے باغ میں آنا خود نانا فرنویس کی بدگمانی پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس ملاقات کے سنتے ہی فوراً اعظم الامراء کے پاس بھاگا آیا اور دولت راؤ کی وجہ ملاقات اور موضوع گفتگو دریافت کیا۔ اعظم الامراء کو موقع تھا انھوں نے اپنے سیاسی داؤ پیچ سے کام لیا اور نانا کے شبہ کو اور بڑھایا۔ نانا نے قسمیں دے کر گفتگو کا ماحصل دریافت کیا۔ اعظم الامراء نے کہا کہ میں اپنی تقریر ملاقات میں صرف ایک بات بتا سکتا ہوں اور باقی آپ قیاس کر لیجئے اور وہ بات یہ ہے کہ دولت راؤ تمہاری تاک میں ہے تم کو بے فکر نہ ہونا چاہیئے نانا نے پھر ان سے اپنے بچاؤ کی تدبیر دریافت کی اور کہا کہ دولت راؤ نے باجی راؤ کو گدی نشین کرکے اپنے اختیارات اس قدر بڑھا دیے ہیں کہ اس سے مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے اعظم الامراء نے اس کو پونا سے فرار ہونے کی تجویز بتائی کہ دولت راؤ کے

پنجہ سے نجات حاصل ہو جائے۔ نانا اس رائے سے اس قدر متاثر ہوا کہ راتوں رات پونا سے بھاگا اور کونکن میں جا کر پناہ لی لیکن اپنے ساتھ ان کو بھی لے جانے کی کوشش کی اور ایک دستہ فوج ان کے باغ پر متعین کر دیا تاکہ ان کو کونکن لائے۔ اعظم الامراء کے لیے بڑی بھاری مشکل تھی۔ رات تو انھوں نے مختلف حیلوں سے گزار دی اور صبح کو فوراً دولت راؤ کو نانا کے فرار ہونے اور اپنے متعلق مطلع کیا کہ نانا مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ باجی راؤ اور پرسرام بھاؤ کو بھی اس کی اطلاع کر دی۔ یہ امداد کے لیے پہنچ گئے اور اعظم الامراء کی حفاظت ہو گئی اور ان کے مشورے سے نانا کا تعاقب کیا گیا لیکن وہ اپنے مستقر پہنچ کر محفوظ ہو گیا۔ اس اثناء میں باجی راؤ اور پرسرام بھاؤ میں مخالفت ہو گئی اور یہ باجی راؤ کے خلاف امرت راؤ کو گدی نشین کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اعظم الامراء نے دولت راؤ کو اس کی اطلاع دی۔ دولت راؤ نے ان سے کہا کہ تم اپنی فوج سے پرسرام بھاؤ کو گرفتار کرو۔ اعظم الامراء نے کہا کہ میں یہاں ایک قیدی کی حالت میں ہوں۔ میرے ہاں فوج کہاں ہے۔ دولت راؤ نے حیدرآباد سے فوج منگوانے کی درخواست کی اس سے اعظم الامراء بہت خوش ہوئے اور انھوں نے خود اپنے آدمی حیدرآباد روانہ کیے اور حضرت غفران مآب آصف جاہ ثانی سے ایک فوج روانہ کرنے کی استدعا کی۔ بندگان عالی نے فوراً ساٹھ ہزار کی ایک جمعیت

میراں یار جنگ، محمد سبحان خاں بہادر کی معیت میں پونا روانہ کی۔ اس فوج کے آنے سے اعظم الامراء کے ہاتھ پیر مضبوط ہو گئے۔ اس فوج نے پرسرام بھاؤ کو اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور باجی راؤ اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے اس کے بعد اعظم الامراء کی قدر و منزلت کرنا اپنے اوپر فرض سمجھا یہ نہ صرف نظر بندی سے رہا ہو گئے بلکہ پونا کے عمائد میں شریک ہو گئے اور پھر سیاسی معاملہ میں ان سے رائے لی جاتی تھی۔ لیکن عمائد پونا اس بات کو سمجھ گئے کہ پونا کی سیاسی پیچیدگی میں اعظم الامراء کا کتنا ہاتھ تھا اور بعض دور اندیش مدبروں کا یہ خیال ہو گیا کہ ان کو کچھ دنوں اور پونا میں رکھا جائیگا۔ تو غالباً اس سے مرہٹہ سلطنت کو بُرے دن دیکھنے پڑیں گے۔ اس لیے ان کو پونا سے رخصت کرنا مناسب سمجھا گیا جو اعظم الامراء کے لیے نہایت ہی مبارک تجویز تھی۔ جب یہ تصفیہ ہو گیا اور ارسطو جاہ باجی راؤ اور دولت راؤ سے مل کر پونا سے رخصت ہوئے اور دریائے سیونا پر قیام کیا تو ان کے پاس کونکن سے نانا فرنویس کے آدمی پہنچے اور نانا کا پیغام استمداد پہنچایا کہ کونکن میں مقید ہوں اور میری رہائی آپ کے بغیر ممکن نہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے اثر سے کام لے کر پونا کے ارکان سلطنت سے میرا تصفیہ کرائیں تاکہ حسب سابق میری وزارت بحال ہو جائے اور اس کا معاوضہ میں نقد روپیوں اور علاقہ ہائے سرکار عالی کی واگزاشت سے کر سکتا ہوں۔

اس پیغام کے وصول ہونے کے بعد اعظم الامراء پھر پونا واپس ہوئے اور باجی راؤ اور دولت راؤ سے ملکر ان ارکانِ سلطنت سے نانا فرنویس کے تعلقات صاف کرنے کی کوشش کی چونکہ اعظم الامراء میں سیاسی جوڑ توڑ کی ایسی صلاحیت تھی اور طریقۂ گفتگو و استدلال بھی بہت موثر اور نفسیاتی پہلو رکھتا تھا اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے بیچ بچاؤ سے باجی راؤ نے نانا فرنویس کا وزیر سلطنت بننا منظور کرلیا چنانچہ اس تصفیہ کے بعد اعظم الامراء نے نانا کو اپنے خطوط سے پونا بلوایا اور پہلے اس کو اپنے خیمہ میں رکھا اور اس کے بعد اپنے ہمراہ باجی راؤ کے دربار لے جاکر ان سے ملاقات کروادی اور تمام ارکانِ سلطنت سے اس کے تعلقات صاف کروادیے۔ باجی راؤ کی پھر مسند نشینی کی رسم ادا کی گئی اور کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر خود اعظم الامراء نے حضرت غفران مآب کی طرف سے قشقہ کی رسم انجام دی۔ اس کے معاوضہ میں نانا فرنویس نے عہد نامہ مہار کے ذریعہ اعظم الامراء کو ایک کروڑ نقد دیے اور تین کروڑ کی دستاویز اور معافی چوتھ کی سند لکھ دی اور قلعہ دولت آباد اور دیگر محالات جو جنگ کھرڈہ میں پونا کو دیے گئے تھے واگذاشت کردیے۔ یہ اعظم الامراء کی بہت بڑی کامیابی تھی جس کو تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

جب اعظم الامراء پونا کے اربابِ سیاست سے رخصت ہوکر اس قدر

کامیابی کے ساتھ حیدر آباد واپس ہوئے تو حضرت غفران مآب بہت خوش ہوئے اور ان سے ملنے کے لیے لاگوڑہ سے گولکنڈہ آئے اعظم الامرا نے قدمبوسی حاصل کی اور جب بلدۂ حیدر آباد آئے تو یہاں پونا کی تمام نذریں اور اسناد وغیرہ پیش کیے چونکہ یہ بہت بڑی کامیابی تھی اور اس سے جنگ کھڑلہ کی بے عزتی کا داغ مٹ گیا تھا اس لیے آصف جاہ ثانی اور اہل ملک اس سے بے حد خوش ہوئے وہ اور ان کے تمام ہمراہی جو پونا گئے تھے مختلف عنایاتِ شاہانہ سے سرفراز کیے گئے چنانچہ ان کو اس وقت سلطنت کے سب سے بڑے خطابات ارسطو جاہ فرزند ارجمند' وکیل مطلق ' مختار دولت آصفیہ عطا ہوئے۔ اس کے علاوہ ہشت ہزاری' ہشت ہزار سوار' ماہی مراتب' مورچل طاؤسی بھی عنایت کیے گئے۔ یہ ایسے اعزاز تھے کہ اس سے پہلے کسی امیر و وزیر سلطنت کو نہیں عطا ہوئے تھے۔ اور کئی روز تک ان کو خلوت مبارک میں ٹھیرایا گیا تھا۔

میسور کی چوتھی لڑائی

جنگ کھرلہ کے بعد انگریزوں کی بے وفائی سے متاثر ہو کر کہ باوجود معاہدوں کے انھوں نے حیدر آباد کی مدد نہیں کی تھی، آصف جاہ ثانی نے فرانسیسیوں کی فوجوں سے مدد لینا شروع کر دیا۔ فرانسیسی افسر موسیو ریمو کو جو حیدر آباد میں تھا حکم دیا گیا کہ وہ حیدر آباد میں باضابطہ فرانسیسی فوج مرتب کرے۔ چنانچہ اس انتظام سے حیدر آباد میں فرانسیسیوں کی ایک باضابطہ فوج مرتب ہو گئی تھی۔ لیکن ۱۷۹۷ء میں جب ارسطو جاہ پونا سے رہا ہو کر حیدر آباد واپس آئے، جنوب ہند کے سیاسی حالات متغیر ہو گئے تھے۔ یورپ میں انگریزوں کے نپولین سے گھمسان کے معرکے ہو رہے تھے اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت مشرق میں بھی دست درازی کر رہی تھی اور ہندوستان میں انگریزوں کا سر کچلنے کے لیے نپولین نے والیٔ میسور ٹیپو سلطان سے کام لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ٹیپو سلطان اور نپولین کے اس معاملے میں اکثر نامہ و پیام ہوئے اور فرانسیسی فوجیں میسور کی امداد کے لیے ٹیپو سلطان کے پاس آ رہی تھیں۔ انگریزوں کے لیے

یہ صورتِ حال بہت خطرناک تھی اور اس کے مقابلے کے لیے انگلستان سے جنرل ویلزلی گورنر جنرل بنا کر بھیجا گیا۔ فرانسیسیوں کے اس خطرہ کو دو کرنے کے لیے ویلزلی کی سب سے اولین تدبیر یہ تھی کہ حیدرآباد سے فرانسیسیوں کا اخراج کر کے حیدرآباد کی سلطنت کو عہد معاونت میں شریک کر لے ویلزلی نے ارسطو جاہ سے کام لیا۔ ارسطو جاہ فرانسیسیوں کے مقابلہ میں انگریزوں کی طرف مائل تھے۔ حضرت غفران مآب کی مخالفت کے باوجود ارسطو جاہ اور ان کے مشیر میر عالم انگریزوں کا اثر بڑھانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت اتفاق یہ ہوا کہ فرانسیسی فوج کے افسر موسیو ریمو کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال سے حیدرآباد میں فرانسیسی طاقت کو بہت نقصان پہنچا اور انگریز اور ان کے ہمدرد ارسطو جاہ اور میر عالم ریمو کی پسماندہ فوج کو ۱۷۹۸ء میں حیدرآباد سے خارج کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اسی سنہ میں حیدرآباد سے عہد معاونت کا سمجھوتہ ہوا تو حیدرآباد کی فوج انگریزوں کے برابر میسور کی لڑائی اور اس کے خاتمے میں شریک ہو گئی۔ ۱۷۹۹ء میں جب میسور کا اور اس کے والی ٹیپو سلطان کا خاتمہ ہو گیا تو اس کے مال غنیمت میں حیدرآباد کو برابر کا حصہ دیا گیا۔ چنانچہ ۱۷۹۲ء کے معاہدہ کی رو سے جو علاقے سرکار نظام کو دیے گئے تھے اس وقت ان کے متصلہ علاقے دیے گئے اور حیدرآباد کی سرحد بہت دور تک پہنچ گئی۔

اخلاق و عادات

ارسطو جاہ کا عہدِ وزارت حضرت غفران مآب آصف جاہ ثانی کے عہد حکومت کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ آصفجاہ ثانی کے انتقال کے بعد یہ صرف دو مہینے زندہ رہے اور سکندر جاہ بہادر کی صرف دو مہینے وزارت کی۔ ۱۲۱۹ھ محرم کے مہینے میں ان کا انتقال ہوا۔ بیرونگر میں ان کا مزار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو جاہ دکن کے اس پر آشوب زمانے کے لیے پیدا ہوئے تھے جس سے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں دکن کا سیاسی مطلع بے حد غبار آلود تھا اور یہ سیاسی کہر اس وقت صاف ہوا ہے جبکہ ۱۷۹۹ء میں میسور کا خاتمہ ہوا۔ ارسطو جاہ بھی اسی وقت تک زندہ رہے اور اپنے ولی نعمت کی آخر وقت تک خدمت کی اور ملک کو ہر مرحلے سے بچایا جس خلوص اور ان تھک کوششوں سے انھوں نے حیدرآباد کی خدمت کی ہے وہ واقعات سے ظاہر ہے مختلف مزاحمتوں کو مغلوب کر کے وزارتِ عظمیٰ پر ترقی کرنا خود ان کی زندگی کا بڑا کرشمہ ہے۔ مالی اور انتظامی کام ان کا بہت بڑا کام ہے مرہٹوں کے یہ تنہا حریف تھے۔ جنگ کھرڑلہ کی مصیبتوں اور بے عزتی کے داغ کو مٹانے میں ان کی

عظیم الشان خدمت ناقابلِ فراموش ہے۔ اپنے ولی نعمت کی مخلصانہ خدمات کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ اعظم الامرا، ارسطو جاہ کی شخصیت دکن کے تمام ارباب سیاست میں ناقابلِ مثال تھی اگرچہ دکن میں بے شمار وزرا، پیدا ہوئے ہیں جو مشہور رہے اور انھوں نے نمایاں کام بھی کیے لیکن ارسطو جاہ کو جو اعزازات اور خطابات عطا ہوئے ان کی کوئی شخصیت دعویٰ نہیں کر سکتی۔ فرزند ارجمند مختار دولتِ آصفیہ ان کے امتیازی خطابات تھے جن سے ان کی حقیقی شخصیت واضح ہوتی ہے تمام ملک میں ان کی اس قدر عزت کی جاتی تھی کہ نورالامرا اور رفعت الملک وغیرہ جیسے بڑے امیر پیدل ان کی پالکی کے ساتھ چلتے تھے۔

ارسطو جاہ نماز روزے اور مذہبی رسوم کے بہت پابند تھے اور بہت خیرات کرتے تھے۔ علماء و فضلا کی صحبت سے ان کو خاص دلچسپی تھی ان کی علمی قابلیت بھی اس حد تک تھی کہ وہ شعر اچھی طرح سمجھ لیتے تھے اور صنائع اور بدائع کا لطف اچھی طرح اٹھاتے تھے۔ تاریخ سے بھی ان کو شغف تھا۔ ملکی انتظام اور فوجی تنظیم سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ فوجی تنظیم میں گزرا۔ گھوڑے کی سواری اچھی طرح جانتے تھے اور گھوڑوں کے شوق کا یہ حال تھا کہ اس زمانے میں بہترین گھوڑے ان کے پاس رہتے تھے۔ پونا میں ان کے گھوڑوں کی بڑی تعریف کی جاتی تھی اور ان کی سواری کو دیکھ کر

پونا کے شہسوار بھی شرماتے تھے۔ بڑی عمر میں بھی جبکہ ان کا بدن بہت بھاری ہوگیا تھا وہ گھوڑے کی سواری سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ بلکہ حضرت غفران مآب کے ساتھ اکثر شکار میں مصروف رہتے تھے۔ فرصت کے اوقات یہ پتنگ بازی اور کبوتر بازی میں صرف کرتے تھے۔ اور ان چیزوں کا ان کو اس قدر شوق تھا کہ پتنگ بازی کے سلسلے میں انھوں نے لوگوں کو جاگیریں دی ہیں۔ مرغ بازی و شطرنج کا کھیل ان کا قابلِ دید ہوتا تھا۔ ان کا حقہ اور اس کی خوشبو حیدرآباد میں بہت مشہور تھی۔ ان اوصاف کے ساتھ گلزار آصفیہ کے الفاظ میں یہ کہنا صحیح ہوگا "شان وشوکت وصلابت ومتانت و وجاہتِ اور ا احدے نمی رسد امارت برو ختم شد۔"

علمی وادبی ذوق

تاریخ میں ایسی ہستیاں کم ملتی ہیں جن کی زندگی کے سیاسی اور ذوقی دونوں پہلو یکساں اہمیت رکھتے ہوں۔ ارسطو جاہ کی مثال میں ان کی فوجی مہمات، سیاسی سرگرمیوں اور ملکی انتظامات کی مصروفیتوں کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے بھی یہ بات کسی قدر تعجب خیز معلوم ہوگی، کہ ان کے اطراف فارسی اور اردو کے ڈیڑھ سو سے زیادہ شعراء کا جمع کثیر موجود تھا۔ ان کے بذل اور حوصلہ افزائی کا شہرہ سن کر شمالی ہند، اور ایران تک سے شعرا کھنچے کھنچے چلے آتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس عہد کا کوئی تذکرہ شعرا ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے صحیح اندازہ ہو سکتا کہ کتنے باکمال سخنور اس زمانے میں دکن کے طول و عرض اور پایۂ تخت میں موجود تھے۔ تاہم اس کا سرسری اندازہ ایک تالیف سے ہو سکتا ہے جو شاہ تجلی علی نے ۱۲۱۵ھ میں اسمٰعیل یار جنگ کی فرمائش پر مرتب کی تھی، اس کا نام "مجموعۂ فصاحت" ہے اور ابھی تک چھپی نہیں۔ یہ کتاب اگرچہ ۱۲۱۵ھ میں مرتب ہوئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کام ۱۲۱۶ھ تک جاری رہا۔ کیونکہ جو تاریخیں اس کے متعلق نکالی گئیں ان سے

۱۲۱۶ھ ہی ظاہر ہوتا ہے۔

مثلاً (۱) ریاض قصائد (۲) قصائد اعظم (۳) دفتر وصف وزیر قابل
اس کا ایک مخطوطہ دفتر دیوانی، ملکی و مال وغیرہ کے کتب خانہ میں اور ایک مکمل مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔ یہ مجموعہ ان تمام قصائد اور قطعات پر مشتمل ہے جو فارسی اور اردو شعرا نے ۱۱۹۴ھ سے ۱۲۱۵ھ کے درمیان مختلف اوقات میں تقریبوں وغیرہ کے موقعوں پر ارسطو جاہ کی مدح میں لکھے تھے۔ مولف نے ان قطعات اور قصائد کو شعرا کے تخلص کے لحاظ سے ردیف وار جمع کیا ہے اس مجموعہ میں بڑا حصہ فارسی شعرا کے کلام کا ہے۔ کچھ حصہ اردو کا بھی۔ بہت سے ایسے شاعر جو اردو میں بھی کافی شہرت رکھتے تھے، اس مجموعہ میں ان کا فارسی کلام درج ہے جملہ شعرا کی فہرست ڈیڑھ سو سے زیادہ ناموں پر مشتمل ہے۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا کچھ حال اور کلام اس مجموعہ کے سوا اور کہیں نہیں ملتا اور بعض خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ غرض اس فہرست میں مشہور اور غیر مشہور سب ہی طرح کے شعرا شامل ہیں مشہور شعرا میں میر اسد علی خاں تمنا، میر عباس علی خاں احسان، میر حسین علیخاں امیان، شاہ تجلی، لچھمی نارائن شفیق، غلام حسین خاں جوہر، احسن الدین خاں بیان، شیر محمد خاں ایمان وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جن میں سے اکثر اپنے زمانے میں استاد سمجھے جاتے تھے۔

قصائد وغیرہ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعراء کو ارسطو جاہ کی ذات سے کس قدر لگاؤ تھا ان کی زندگی کے تقریباً تمام اہم اور قابلِ ذکر مواقع (مثلاً خطاب کی سرفرازی، جشن سالگرہ، جشن نوروز، عید الفطر، عید اضحیٰ، فتح میسور، واپسی از پونا، ولادت اولاد وشادی بیاہ وغیرہ) پر ایک سے زیادہ شاعروں نے قطعے اور قصیدے گزرانے ہیں۔ قصیدے کی شاعری، اس میں شک نہیں کہ رسمی ہوتی ہے لیکن جہاں جہاں شخصی اشارے اور ذاتی واقعات آجاتے ہیں ان سے موصوف کی ذات کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔ اس شاعری کے محرکات کچھ ہی ہوں لیکن اس سے تاریخی واقعات پر روشنی ضرور پڑتی ہے اور سب سے زیادہ خود ارسطو جاہ کی ادب دوستی کا ایسا واضح پتہ چل سکتا ہے جو شاید کسی اور ذریعے سے ممکن نہ تھا۔ ارسطو جاہ کے سوانح نگار کے لیے اس مجموعے میں بہت بڑا مواد موجود ہے۔ عید، شادی، بیاہ، فتح ونصرت، ولادت، مکان یا باغ کی تعمیر حتیٰ کہ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات جن سے عام طور پر تاریخ نگاروں کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا، ان سب کے متعلق اس مجموعے میں قصائد اور قطعے موجود ہیں۔ دفتر دیوانی میں اس مجموعہ کا صرف پہلا حصہ ہی محفوظ ہے جس میں (۶۶) شعراء کے قصیدے اور قطعات موجود ہیں۔ دوسرے حصے میں اور ۴۵ شعرا کے قصیدے وغیرہ ہیں۔ اور یہ مکمل کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔

بلحاظ ردیف شعراء کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

الف ۱۸ شعراء۔ ب ۳ شعراء۔ ت ۵ شعراء ث ایک شاعر
ج ۴ شعراء۔ چ ایک شاعر۔ ح ۶ شعراء۔ ذ ۲ شعراء۔ ر ۴ شعراء۔ ز ۲ شعرا
س ۹ شعراء۔ ش ۶ شعراء۔ ص ۲ شعراء۔

سب سے زیادہ قصیدے تجلی کے ہیں جن کے اردو قصائد کی تعداد دس ہے اس کے بعد "احسن" کے ۹ قصیدے ہیں، سب سے طویل قصیدہ تجلی ہی کا ہے جس کے ایک سو چالیس شعر ہیں۔

کئی شعراء کے قصیدے ایک ہی قافیہ و ردیف میں ہیں مثلاً ردیف "دست" اس میں تجلی، ایماء، سحر کے قصیدے ہیں۔ ہر ایک کا مطلع ملاحظہ ہو۔

تجلی :۔

گر وصل گلبدن دے مجھے ایک بار دست ہر مو سے بہر شکر ہوں پیدا ہزار دست

ایماء :۔

بے زر جہاں میں کچھ نہیں آتا بکار دست بد تر ہے آستین سے بے اقتدار دست

سحر :۔

یارب دے اس کا یوں مجھے بوس و کنار دست لب لب سے ہر سے یہ ہو گلے میں ہو ہار دست

وزارت کی ردیف میں ایمان اور ایماء دونوں کے قصیدے ہیں :۔

ایمان:-

پیدا ہے ترے چہرے سے یہ شانِ وزارت
جو دیکھے سو بولے کہ ہے شایانِ وزارت

ایماں:-

پھبتی ہے تجھے نامِ خدا شانِ وزارت
ہے ذاتِ مقدس تری شایانِ وزارت

مزید طوالت کے خوف سے ہم صرف بعض قصائد سے تشبیب، گریز، مدح کے اشعار پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:-

تشبیب

ایمان:-

بحمد اللہ مجھ تک صبحدم پیکِ صبا پہنچا
نویدِ دولتِ جاوید کو لیتا ہوا پہنچا

کہا مجھ سے کہ اب کیونکر نہ ہو گُل گُل شگفتہ تر
کہ دامانِ اجابت کو ترا دستِ دُعا پہنچا

تو اپنے عقدۂ دل کو دکھا یا کھول جوں غنچہ
ترا بھی مقصدِ دیرینہ تا حاجت روا پہنچا

تجلّی:-

ہیں اب کے ایک سال میں پیدا بہار دو
اک گل پہ جھوم جھوم کے آئے ہزار دو

گل کوئی شمع کوئی سمجھ بلبل و پتنگ
قرباں ہیں صبح و شام بصد اضطرار دو

سیلان ہے بسکہ جوشِ رطوبت سے باغ میں
سرو چمن کے بیچ ستے جوئبار دو

موجِ نسیم آئینۂ آبشار سے
صیقل سا صاف کر دیا زنگِ غبار دو

یاں تک نموں کا زور ہے نکلے زمیں کو چیر
یک بیخ سے گلوں کی بھری شاخسار دو

شل دو دست بذل و سخا شش جہت کے بیچ
جاری ہوئے ہیں نہروں سے آب آبشار دو

دل چاہتا ہے آج رگ گل میں گوندھ گوندھ
پہنوں میں کیا کر کے عطر سے پروردہ ہار دو

سخن :-

جلوہ حسن شفق کے کہوں کیا میں مثل گل
آتش طور بھڑکتی ہے بہر دشت و جبل

رنگ ہے رنگ چمن پر کہ تماشا کے لیے
شاہد نکہت گل آتی ہے پردہ سے نکل

جوش یکرنگی ہے یاں تک کہ چمن چاہے ہے
آشنائی سے کرے سبزہ بیگانہ بدل

باعث صافی مرآت سکندر ہر حوض
موجب آبروئے عین بقا ہر منہل

لطف تحقیق ہے اس فصل میں تقلید سے باز
سخت جانکاہ ہے بوئے گل کاغذیہ جعل

بسکہ دلکش ہے ہوائے چمنستان جہاں
دخل کیا غنچہ تصویر کا دل ہو یہ بغل

فیض ارشد ہے اس ایام میں عام ایسا کہ
خود بخود ہووے ہے حل عقدہ مالا ینحل

امر دشوار ہے شاعر بھی غزال معنی
باندھے گر چاہے بصد رشتہ فکر اطول

گریز

تجلی :-

کب تک کریگا شکوہ زمانے کے ہات سے
کچھ بھی دیا ہے تجھ کو اگر اقتدار دست

جا اس کے پاس جس کے تجمل کے روبرو | اقبال و جاہ باندھے ہیں ہیں بیار دست
ہے وہ جناب اعظم الامرا کہ جس کے پاس | یعنی چلے ہیں باندھ کے کئی کئی قطار دست

ایضاً

غیر از گرہ گرہ میں مرے کچھ نہیں رہا | لایا ہے پیچ میں ستم روزگار دست
میں اس کی دستگیری کا امیدوار ہوں | اک دست پہ ہے صدقے کیے ہے ہزار دست
یعنی وہ کون اعظم الامرا ہے جس کا نام | ہر امر میں اسی کا ہے حاجت برار دست

تمنا :-

لیکن گرہ وہ جس سے کہ دل کی کھلے گرہ | دنیا میں نہیں ہے ایک گرہ کے سوا گرہ
گر چاہتا ہے تو کہ ہو وا شد او سے نصیب | ناخن سے بستگی کے جو ہووے رہا گرہ
چل ایک بارگاہ وزارت پناہ میں | وہ کئی دنوں سے دل میں جو ہے مدعا گرہ

سحر :-

اتنے میں مجھے طوطی نے بولی نہ خفا ہو | اس سنگ تحیر سے نہ آئینہ نما ہو
مشہور مثل ہے جسے جی چاہے سو ہو پاس | وہ نور نظر سامنے ہی جلوہ نما ہو
کس کا ہے تو مداح ترا کون ہے ممدوح | کوئی ایسا کہیں فخر سے اب جد ہوا ہو
تب میں نے کہا طوطی سے اے حال کے شاہد | میں نام سنوں اس کا تو کچھ مدح و ثنا ہو
بولی کہ یہ کیا بولے ہے دیوانہ بشر ہے | وہ اسم مبارک تو کئی بار سنا ہو

مشہور رسم و جہر کے مطلع سے ہے جگ میں
جس نیر اعظم کا لوا مہر و سما ہو

احسن :-

الغرض دیکھ کے اس ٹھاٹ کو میں نے پوچھا
بارے کس واسطے ہیں اہل طرب جمع یہاں

یہ صدا سنتے ہی محفل سے اک اہل تمیز
مجھ سے کرنے لگا تفصیل سے اس طور بیاں

وہ جو ہے ابن ارسطوئے زماں کیواں جاہ
صاحب تاج و لوا بادشہ کون و مکاں

مدح

تجلی :-

دریا شی تیری دیکھ کے ہر صبح آفتاب
رکھتا ہے اپنے چہرہ پہ ہو شرمسار دست

بذل و سخا و جود و کرم فیض و لطف و خلق
کھولے ہیں تیرے سامنے ہفتاد بار دست

حلقہ میں تیرے دام کے ہو پیر چرخ صید
کردے ہے جب بلند تو بہر شکار دست

تیری سخا کا پایۂ عالی ہے یوں بلند
پہنچا نہیں سپہر کا واں زینہار دست

ہو گئے ہیں تنگدست جہاں کے کشادہ دست
پایا ہے جب کرم سے ترا اشتہار دست

احسان :-

اے کرم بخش جہاں فیض عبادت تیری
سینہ دریا ہے صدف دل ہے اور ایماں گوہر

تجھ سے سائل ہو جو اک جو کا کوئی وقت نیاز
دیوے گندم کی جگہ تول کے قرآں گوہر

لب سے ثنا ہا ترے نکلے ہے سخن بھی دُر ریز
ہیں بہم شیر و شکر لعل بدخشاں گوہر

ایہام :۔

تجھ تیغ آبدار کا اے دستیار خلق
او چھا سا گر لگے بسر کو ہسار دست

گاؤ زمیں کے کاٹ کے چو رنگ تا بہ تخت
ذرہ خطا کرے نہ تراز نہار دست

ایضاً

جس جائے زور بازو کا مذکور ہو تری
حسرت سے کاٹنے لگے اسفندیار دست

رستم ترے حضور ہے ایک منہ پہلوان
پنجہ سے کب کرے ترے بر رو و چار دست

سرمہ کی طرح خاک ہو ایک ہی فشار میں
کر دیوے سنگ لاخ کو تیرا فشار دست

ایضاً

ولدل نسب براق حسب ہے ترا کمیت
خنگ فلک ہے اس سے فروتر ہزار دست

جب تھان سے کھلے ہے وہ گلگشت کیلئے
باندھی ہے اس کے روبرو باد بہار دست

عرصہ یہ شش جہت کا نہایت ہی تنگ ہے
مت ڈال اس کی باگ پہ اے شہسوار دست

ٹھیرے نہ وہ زمین پہ پھر آسماں سوا
گر اس کی پائے وہم کو دے اضطرار دست

ایضاً

ہاتی تری سواری کا اتنا ہے سربلند
ہر پہنچائے آسماں تک اس کا سوار دست

خوبی سیاہ سینہ کی اس کی میں کیا کہوں
ملتا ہے جس کو دیکھ کے ابر بہار دست

سخن :-

روئے انور کی تیرے وصف رقم کرنے کو — دمبدم صبح کرے ہے زرِ خورشید کو حل
بذل گوئی ہے تیری ہم نفس سحرِ حلال — اور شکر ریزیٔ گفتار ہے ہم شانِ عمل
کیا عجب قوتِ سخن فیض ہوائے لب سے — شیریں ہو جائے اگر ایک ہی دم میں حنظل
تا کجا شرح کروں میں ترے اوصاف کو آب — خرقِ عادت سے غرض کم نہیں یہ حسنِ عمل

شعراء کی سرپرستی

ارسطو جاہ کے متوسل شعراء میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جن کو دربار سے کوئی تعلق نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر ہندوستان اور خصوصاً دکن میں اردو شعراء کا قدردان اور سرپرست ارسطو جاہ سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا اکثر شاعر ایسے تھے جن سے ارسطو جاہ کو محبت اور شخصی دوستی تھی۔ چنانچہ شاہ تجلی سے ان کی وابستگی مشہور ہے۔ جن سے انھیں وابستگی ہو جاتی۔ اسے طرح طرح سے نوازتے تھے۔ چنانچہ شاہ تجلی نے جب حضور پر نور کی تصویر بنائی تو اس کو ملاحظہ میں پیش کر کے انہیں انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا۔ خود بھی کافی امداد کی اور امراء دربار سے بھی انہیں بہت کچھ دلایا۔ پھر جب ان کی لڑکی کی شادی ہوئی تو ان کی سعی سے خود حضور بھی تشریف فرما ہوئے اور تحفہ کے طور پر جواہرات وغیرہ عطا کیے اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دولھا کو ایک اچھے عہدے پر مامور کیا۔ غرض جہاں تک ہو سکتا وہ اہل علم و فضل اور شعراء کی قدردانی میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ شعراء ان کی ذات میں اپنا سچا ہمدرد اور بہی خواہ پاتے تھے اور احسانات کے اعتراف کا جو موقع بھی ملتا اسے ضائع نہیں ہونے

دیتے تھے۔ ان کی فیاضیوں کا شہرہ کوئی شبہ نہیں کہ بہت دور تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ احسن الدین خاں بیانؔ جو ایک سنجیدہ شاعر تھے اسی زمانے میں شمال سے یہاں وارد ہوئے اور جس چیز نے انھیں اتنا طویل فاصلہ طے کر کے دکن آنے پر ابھارا تھا اس کا تذکرہ اپنے خاص انداز میں ایک قصیدے میں اس طرح کرتے ہیں :۔

ہمیشہ دل میں مرے یہ خیال آتا ہے ... کہ کھینچے پھرتی ہے کیوں کر مجھے تقدیر
میرے تو دل میں تلاش معاش ادنیٰ نہیں ... کہ جس کے واسطے اتنا فلک کرے تشہیر
مگر تلاش تھی دل میں تو شخص عالی کی ... وہ خواہ امیر بظاہر ہو خواہ ہوئے فقیر
سو ایسی دولت جاویدیاں دکن میں ملی ... کہ ایک شخص کو پایا ہے بے عدیل و نظیر
امید یوں ہے کہ اس کیمیا کی خدمت میں ... ہماری بھی مس ناقص کو ہوئے کچھ تغییر

بجا ہے مدح میں اس کی اگر ہزار جگہ ... اس ایک شعر کو سو دکے میں کروں تحریر
غرض نہ خلق ہو دنیا میں آدمی ایسا ... کریں جو خاک کو آدم کے لاکھ بار خمیر"

ٹیپو سلطان کی کسی شکست کے موقع پر بیانؔ ہی نے ایک ترجیع بند گزرانا تھا جس کے چند شعر یہ ہیں :۔

یا الٰہی تا قیامت فتح و نصرت ہم رکاب   اس درِ دولت کے بداندیش کا خانہ خراب

آتشِ دوزخ میں ہو بدخواہ کا سینہ کباب   خیر خواہوں کی دعا کیسی ہوئی یہ مستجاب

شاہِ عالم نے دیا تھا رستمِ دوراں خطاب   سو خدا نے کر دکھایا راست اے عالیجناب

خاندانِ آصفی کا ہے موید کردگار   مرہٹے سارے یہاں کی ہیں مدد سے استوار

ہے اسی تائید سے دکھن کے بیچ ان کو قرار   نام کی ہیبت سے آخر کر گیا ٹیپو فرار

شاہِ عالم نے دیا تھا رستمِ دوراں خطاب   سو خدا نے کر دکھایا راست اے عالیجناب

ایک اور شاعر جن کو آصفجاہی دربار سے انورالدولہ کا خطاب عطا ہوا تھا ارسطوجاہ کی فیاضیوں کا تذکرہ ایک قصیدے میں یوں کرتے ہیں۔

ہمت عالی کا اس کی کیا کروں تجھ سے بیاں   روبرو اس کے ذرہ حاتم کو نہیں ہے اعتبار

جو دکھن میں ہوئی ہے سرفرازی ایک بار   ہند میں بخشش کہاں ایسی ہوئی بتلا اے یار

دور میں کس کے جواہر اس قدر بخشش ہوا   دیکھ لے تاریخ تیموری اٹھا تفصیل وار

میر حسن علی خاں ایمان نے ارسطوجاہ کے ہاتھی کی تعریف حسب ذیل لکھی ہے:-

ہاتھی تری سواری کا اتنا ہے سربلند   پہنچا ہے آسمان تک اس کا سوار دست

ہر چند اس زمیں کے قصیدے میں اور بھی   خم نہیں کسی کے آگے مرا زینہار دست

اس ردیف اور قافیے کے قصیدے "مجموعۂ فصاحت" میں کئی ہیں جو مختلف شعرا کے لکھے ہوئے ہیں اور ہر ایک نے اپنی بساط بھر داد سخنوری لینے کی کوشش کی ہے۔

عید کے موقع پر اکثر شعراء قصیدے گزرانتے اور انعام اکرام پاتے تھے۔ میر عباس علی خاں احسان کے اس طرح کے ایک قصیدے سے ذیل کے اشعار اقتباس کیے جاتے ہیں۔

حاسدوں کی عقل ناقص جام حیراں ہوگئی عید بھی آکر ترے در پر سے قرباں ہوگئی
کثرت خلق اور مبارک باد عالم سے تمام صحن دولت خانہ عالی گلستاں ہوگئی
آسمان فیض کا خورشید ہے تو جلوہ گر کہکشاں بخشش کو تیرے زر کی ہمیاں ہوگئی

ہر طرف سرسبز گویا گلشن کشمیر ہے
بلکہ قدموں سے ترے دکھنی صفاہاں ہوگئی

ارسطو جاہ کی یہ بخششیں تھیں جن کے سبب سے آصفجاہی پایۂ تخت شمالی ہند اور دکھن کے بڑے بڑے شعراء کا مسکن بن گیا تھا اور ان کے آپس کے میل جول سے قدیم دکھنی شاعری اس قدر متاثر ہو رہی تھی کہ نواب نظام علیخاں بہادر کے آخری زمانے تک دکھنی شاعری کا اسلوب بالکل بدل چکا تھا۔

ارسطو جاہ کی اولاد

افسوس ہے کہ ارسطو جاہ کی زندگی جس طرح سیاسی اور علمی دنیا میں کامگار اور خوشحال رہی اتنا ہی ان کو اپنی اولاد کا غم دیکھنا نصیب ہوا چنانچہ تذکرہ گزر چکا ہے کہ ان کے اکلوتے فرزند سپہدار جنگ سیف الدولہ عرف مالی میاں عین عنفوان شباب میں ۱۳ ؍ شعبان ۱۲۰۷ھ کو انتقال کر گئے۔ جس کا بوڑھے باپ کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچا۔

سیف الدولہ مالی میاں کی بیوی فرزند بیگم دختر تھیں محمد صفدر خاں غیور جنگ اشجع الدولہ اشجع الملک خانخاناں اور خیر النسا بیگم عرف بہجت بیگم دختر درگاہ قلی خاں سالار جنگ، کی۔ اس طرح سے ارسطو جاہ اور نواب سالار جنگ بہادر کے خاندان سے بہت قدیم قرابت و رشتہ بھی ہے۔ اور خاندان سالار جنگی کا یہ رشتہ میر عالم سے رشتہ ہونے سے بہت پہلے ہی کا ہے۔ کیونکہ ارسطو جاہ سے یہ رشتہ ۱۱۹۵ھ میں ہوا تھا، اور میر عالم کی صاحبزادی سے منیر الملک کی شادی ۱۲۱۳ھ میں ہوئی۔

سیف الدولہ اور فرزند بیگم کے بطن سے جہاں پرور بیگم پیدا ہوئیں

جن کی شادی سنہ ۱۲۱۴ھ میں بڑی دھوم دھام سے نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ سے ہوئی جو بعد کو آصفجاہ ثالث ہوئے۔ اس شادی کی تقریب میں بیسیوں شاعروں نے قصیدے اور قطعات تاریخی لکھے جو اب تک موجود ہیں آصفجاہ ثالث کو ان کے بطن سے سنہ ۱۲۱۶ھ میں ایک فرزند میر تفضل علی خاں میر بادشاہ اور بعد کو دو دختریں پیدا ہوئیں۔ ایک غفور النسا بیگم جو ناکتخدا فوت ہوئیں اور دوسری نامدار النسا بیگم جن کی شادی ناصر الدولہ رابع نے میر ابو القاسم نصیب الدولہ بہادر سے کردی۔ سیف الدولہ مالی میاں کی دوسری دختر امت السلام بیگم تھیں جو شہیار الملک سے بیاہی گئیں۔ ارسطوجاہ کی اولاد اور قرابتوں کا شجرہ یہاں درج کیا جاتا ہے جس کے مطالعے سے بیک نظر حیدرآباد کے چند مقتدر امرا کے قرابتی تعلقات ظاہر ہوں گے۔

فرخ نژاد خاں — شیر جنگ — درگاہ قلی خاں سالار جنگ

غلام سید خاں ارسطوجاہ — غیور جنگ — زوجۂ خیر النساء بیگم

سپہدار جنگ سیف الدولہ مالی میاں زوجہ فرزند بیگم

امت السلام بیگم زوجہ شہیار الملک — جہاں پرور بیگم زوجۂ سکندر جاہ آصفجاہ رابع

میر تفضل علیخاں میر بادشاہ — غفور النسا بیگم — نامدار النسا بیگم زوجۂ نصیب الدولہ

سب رس کتاب گھر

اگر آپ کو اردو کی جدید ترین اور دلچسپ اور سستی کتابیں خریدنی ہوں تو سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن سے مشورہ کیجئے۔